وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُونَ

٦:١١١

إزالة التراب عن حقيقة الانتخاب

ووٹنگ کے چہرہ سے

نقاب کشائی

إزالة التراب عن حقيقة الانتخاب

ووٹنگ کے چہرہ سے

فہرست

الاستفتاء:

مفتی صاحب ووٹ کی شرعی حیثیت کیا ہے واضح فرمایئے؟

بعض حضرات اسے شہادت، وکالت، سفارش اور مشورہ کہتے ہیں اور واجب تک ثابت کرتے ہیں کیا حقیقت میں فقہ کی رو سے ووٹ کی یہی حیثیت ہے؟

جمہوریت کفریہ نظام ہے یا اسلامی نظام اگر کفریہ نظام ہے تو اس کا اہم رکن ووٹ ہے کیا کفریہ نظام کا اہم رکن جائز ہو سکتا ہے؟

اہون البلیتین کے تحت ووٹ دینا جائز ہے یا نہیں؟

براہ کرم تسلی بخش جواب عنایت فرمایئے

الجواب باسم ملہم الصواب:

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے

اسلام ایک مکمل نظامِ حیات ہے۔ اس کے آتے ہی دنیا میں موجود تمام ادیان منسوخ قرار دیے گئے۔ چوں کہ سیاست اور نظامِ حکومت بھی دین کا ہی حصہ ہے لہذا اسلامی نظام کے ہوتے ہوئے تمام نظامہائے حکومت کالعدم قرار دیے گئے۔

﴿إِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْإِسْلَامُ﴾ (آل عمران)

جب تک مسلمانوں نے اس حقیقت کو سمجھا اور اس پر عمل پیرا رہے، عزت و شرافت، حکومت و بادشاہت اور ہر طرح کی دینی و دنیوی ترقی سے بہرہ ور رہے اور باطل ان کا محکوم و مرہون بنا رہا، لیکن جب مسلمانوں میں عیاشی اور دین بیزاری پیدا ہوئی جس کے نتیجے میں زمامِ حکومت ان کے ہاتھ سے نکل گئی تو جس طرح ان کے اعمال اور اخلاق پستی کا شکار ہوئے اس طرح ان کے افکار و نظریات بھی روبزوال ہوئے اور پھر یہ سلسلہ چلتا ہی رہا، یہاں تک کہ دشمن غالب، مسلمان مغلوب اور دشمن حاکم، مسلمان محکوم بن گئے۔

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ﴾ (آل عمران)

جب بات یہاں تک پہنچ گئی تو چوں کہ اس قوم کی خاکستر میں چنگاری موجود تھی اور بہت ممکن تھا کہ یہ چنگاری ایک دن شعلۂ بے قابو بن کر اٹھے اور ماضی کے تمام کرتوتوں کا دشمن سے ایک ایک کر کے حساب لیا جائے، اس لیے انہوں نے اس انقلاب کو ناممکن بنانے کی ہر ممکن کوشش کی اور طرح طرح کے سازشیں رچیں۔

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے

ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات

ان ہی میں سے ایک "جمہوریت" نامی دل فریب نظامِ حکومت بھی ہے۔ جس کا ظاہر تو بڑا خوبصورت اور دل ربا ہے لیکن باطن اتنا ہی غلیظ اور بے تکا ہے۔ اس کی حقیقت دو لفظوں میں بیان کی جائے تو" یہ عوام کی حکومت ہے۔ "تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ایک نمائندہ حکومت کے لیے عوام کے سامنے امیدوار بن کر آتا ہے، اگر عوام کی اکثریت اس کی طرف ہو جاتی ہے تو اسے کامیاب تصور کیا جاتا ہے اور زمامِ حکومت اس کے سپرد کی جاتی ہے اسی کو "الیکشن" اور عوام کے اس انتخاب کو "ووٹ" کہا جاتا ہے۔ اس میں بظاہر کوئی بات قابلِ اشکال نظر نہیں آتی لیکن یہ اپنے اندر جھوٹ و فریب کا ایک سمندر لیے ہوئے ہے۔

چناں چہ جمہوریت کا سب سے پہلا رکنِ اعظم یہ ہے کہ اس میں عوام کو حاکمِ اعلی تصور کیا جاتا ہے اور عوام کا ہر فیصلہ جو کثرتِ رائے کی بنیاد پر ہو واجب التعمیل اور نا قابلِ تنسیخ سمجھا جاتا ہے، کثرتِ رائے کے اس فیصلے پر کوئی قدغن اور پابندی عائد نہیں کی جاسکتی، خواہ وہ قرآن و سنت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اگر کسی جگہ ایسا قانون بن بھی جائے جو شریعت کا حکم ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہو گی کہ یہ اللہ کا حکم ہے بلکہ اس کا سبب صرف اور صرف یہ ہو گا کہ کثرتِ رائے اس کو حاصل ہے، اسی لیے اگر کثرتِ رائے جب چاہے اس کو ہٹا سکتی ہے۔ گویا اس نظام میں حکمِ اعلی اللہ رب العزت والجلال کے بجائے عوام کی ملکیت ہو کر رہ جاتا ہے۔ (اسی کثرتِ رائے کے حصول کا نام ووٹنگ ہے)۔ اب جب کہ بات یہ ہے تو مذہب و دین کا سیاست سے کوئی تعلق ہی نہیں ہو گا، پس یہی تصور باور کرایا گیا کہ مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے، جو اس کی ذاتی زندگی سے متعلق ہے، ریاستی معاملات میں اسے کوئی سروکار نہیں۔ (نعوذ باللہ)

الغرض یہ اور اس طرح کے کثیر مفسدوں کو یہ نظامِ حکومت لیے ہوئے ہے۔۔۔ ہوتا تو یہ کہ اس کے راز کو ہمارے علماء و اکابر فاش کر کے لوگوں کو اس سے متنبہ کرتے اور حقیقی اسلامی نظام کی دعوت دیتے لیکن چوں کہ زمانہ کے بدلتے قیادت کے افکار بھی بدل گئے چناں چہ پہلے جس منصب کا مقصد یہ تھا کہ وہ دین پر لگنے والے غبار کو دور کرتا اور اسلام کے حسین چہرہ پر لگنے والی ہر گرد کو ہٹاتا خواہ اس کی وجہ سے جان و مال خطرہ سے دوچار ہو؛ اسی منصب پر چند دہائیوں سے کچھ ایسے لوگ براجمان ہوئے ہیں جو بجائے اس کے کہ اپنے اسلاف کے طریقے پر چل کر وہ بھی دینِ اسلام کی حفاظت کی خاطر اپنی جان و مال کی پرواہ کیے بغیر حقیقت نوازی سے کام لیتے اور "تحریف الغالین" و "انتحال المبطلین" کا پردہ چاک کرتے لیکن انہوں نے اس کے بجائے اسی گرد و غبار کو اسلام کا حصہ بنانا شروع کیا جس کی وجہ سے اس کی حقیقت مسخ ہونے لگی۔۔۔ و إلی الله المشتکی

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں

ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

ان ہی بے جا کوششوں میں سے جمہوریت کو مشرف باسلام کرنے کی کوشش ہے، جس میں انہیں کافی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی لیکن چوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق ایک جماعت ہمیشہ حق کی حفاظت کے لیے بر سرِ پیکار رہے گی خواہ میدانِ عمل ہو یا میدانِ علم، اس جماعت کی بدولت ان کے اس فریب کی حقیقت کھل کر سامنے آئی اور لوگوں کو آہستہ آہستہ یہ بات سمجھ میں آنے لگی کہ یہ جھوٹی جمہوریت کسی آمریت یا اشتراکیت سے کم نہیں ہے۔

میری طرف سے بطورِ تحفہ ایک حدیث ان قائدین کے پیشِ خدمت ہے اور اس سے زیادہ لب کشائی ضروری نہیں سمجھتا ہوں:«من كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليقل خيرا أو ليصمت» (صحيح البخاري)

ووٹ کی شرعی حیثیت:

ذکر کردہ تمہید سے یہ بات واضح ہو چکی ہو گی کہ جمہوری نظام میں ووٹ ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہے کیوں کہ اس کا سارا مدار رائے عامہ کو حاصل کرنے پر ہے اور اس کا ذریعہ ووٹ ہی ہے۔ لہذا ضرورت اس بات کی ہے کہ اس کی شرعی حیثیت بیان کی جائے۔

ووٹ چوں کہ اسی کفری نظامِ جمہوریت کا حصہ ہے، اسی لیے اصلا تو یہ ناجائز اور حرام ہی ہونا چاہیے تھا چناں چہ وہبہ زحیلی لکھتے ہیں:

[في الجملة إن السيادة في الديمقراطية الغربية للأمة مطلقا، وفي الإسلام هي للشريعة والأمة معا... هذا الفارق الجوهري بين النظامين يجعل المسلمين في حرج، وعليه الامتناع مادام النائب يملك التحليل والتحريم ومخالفة أحكام الشريعة، لأن المشرع في الإسلام هو الله تعالى مباشرة أو ما أوحى به إلى رسول الله صلى الله عليه وسلم.] (موسوعة الفقه الإسلامي والقضايا المعاصرة)

لیکن چوں کہ حالات کے تناظر میں جہاں امتِ مسلمہ ہر طرح کی کسمپرسی کا شکار ہے اور خلافتِ اسلامیہ کی کوئی کامیاب جدوجہد کے آثار نظر نہیں آرہے ہیں، ایسے وقت میں ووٹ سے کنارہ کشی مسلمانوں کے لیے مزید تباہی و بربادی کا باعث ہو سکتی تھی اس لیے فقہ کے ضابطہ "إذا تعارض مفسدتان روعي أعظمهما ضررًا بارتكاب أخفهما" (الأشباه) کے تحت مجبورًا ووٹ دینے کی اجازت دی گئی چناں چہ مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ایک عبارت اسی طرف مشیر ہے فرماتے ہیں:

"اور یہ شرعی و عقلی قاعدہ ہے کہ جس جگہ دو قسم کے ضرر جمع ہوں، ایک اشد دوسرا اہون تو اہون کو اختیار کر لینا چاہیے یعنی جہاں دونوں شقوں میں مفسدہ ہو، مگر ایک میں اشد ایک میں اخف ہو، تو اشد سے بچنے کے لیے یا اس کو دفع کرنے کے لیے اخف کو گوارہ کر لیا جاتا ہے اور ہے تو یہ بھی برا مگر دوسرے مفسدہ کے مقابلہ میں پھر بھی اخف ہے، موجودہ حالات میں افسوس اور نہایت افسوس ہے کہ مسلمانوں کی ایسی جماعت جو خالص اسلامی جماعت اور غلبہ و قوت والی ہو نہ موجود ہے نہ قریب میں اس کی توقع ہے، اس لیے ایسے حالات میں عارضی حکم یہی ہے اور اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں کہ مسلمان موجودہ جماعتوں میں سے کسی جماعت میں داخل ہوں اور قواعدِ شرعیہ کی رو سے ان میں جو نقص ہو ان کی اصلاح کریں اور اگر ان میں ایک کی اصلاح آسان ہو اور دوسرے کی دشوار ہو تو مذکورہ قاعدہ کے مطابق اسی میں داخل ہو جائیں جس کی اصلاح آسان ہو"۔(مروجہ سیاست کے شرعی احکام)

"اہون البلیتین" کے تحت لگنے والے حکم میں اس بات کی تصریح ضروری ہوتی ہے کہ اصلًا یہ ناجائز ہی ہے لیکن دفعِ مضرت کے لیے اس کو اختیار کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ وضاحت نہ کی جائے تو عام خیال اس کو گناہ و ناجائز نہ سمجھنے کا بن جاتا ہے اور پھر جہاں مجبوری نہ ہو وہاں بھی لوگ اس کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس کی واضح مثال تصویر کا مسئلہ ہے جس کی ضرورت شدیدہ پاسپورٹ وغیرہ کے موقع پر علماء کرام نے اجازت دی مگر جس طرح اس کے جواز کی

تشہیر کی گئی اس شدت کے ساتھ اس بات کی وضاحت ضروری تھی کہ اصلااس کی حرمت کو بتایا جائے لیکن اس میں کمی آگئی اور اس امرِ حرام کی قباحت کم ہوتی چلی گئی اور بات بہت آگے تک پہنچ گئی۔۔

ٹھیک اسی طرح ووٹ کے مسئلہ میں بھی ہوا کہ جمہوریت کی تحریرًا و تقریرًا عوام و خواص میں نقاب کشائی نہیں کی گئی اسی طرح ووٹ کی شرعا اجازت کے پسِ منظر کی بھی وضاحت سے بالکل رخ پھیر لیا گیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک بہت بڑے عالمِ دین نے ووٹ کو مشرف باسلام کرتے ہوئے اسے جواز کی حد سے آگے بڑھا کر ایک شرعی فریضہ قرار دے دیا۔ ان کے اس شرعی حکم کے تحریر کرنے کا باعث و محرک یہ بات تھی کہ اس نظامِ حکومت کو اکثر دیندار طبقہ اسلام مخالف سمجھ کر انتخاب کے اس ڈرامے میں حصہ نہیں لیتا۔۔۔فیاللعجب۔۔ نیت کی درستگی میں کوئی شک نہیں کہ قوم و ملت کی فلاح و بہبود ہی مقصود تھی لیکن طریقہ غیر موزوں تھا۔ (واللہ اعلم) چناں چہ وہ فرماتے ہیں:

"لکھے پڑھے دیندار مسلمانوں کی بھی اس طرف توجہ نہیں ہوتی کہ یہ کھیل صرف ہماری دنیا کی نفع نقصان اور آبادی یا بربادی تک نہیں رہتا، بلکہ اس کے پیچھے کچھ طاعت و معصیت اور گناہ و ثواب بھی ہے، جس کے اثرات اس دنیا کے بعد بھی ہمارے گلے کا ہار عذابِ جہنم بنیں گے، یا پھر درجاتِ جنت اور نجاتِ آخرت کا سبب بنیں گے۔"

پھر ان ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے بعد والے تقریبا تمام نے ووٹ کی وہی حیثیت بتلائی جو حضرتؒ نے متعین کی تھی اور کچھ اسی طرح ہوا جس کے متعلق ابن عابدینؒ لکھتے ہیں:

قلت: وقد يتفق نقل قول في نحو عشرين كتابا من كتب المتأخرين، ويكون القول خطأ، أخطأ به أول واضع له، فيأتي بعده وينقله عنه، وهكذا ينقل بعضهم عن بعض. (شرح عقود رسم المفتی)

یہاں مقصود ان حیثیتوں کا تجزیہ کر کے ان کا جائزہ لینا ہے جو مفتی صاحب اور دیگر لوگوں نے متعین کیں۔

لیکن اس سے پہلے بنیادی اور مجموعی طور پر نظامِ جمہوریت، ووٹنگ اور اسلام کے مابین تضادات کا ذکر مناسب ہو گا جس کی طرف کچھ اشارہ پہلے بھی کیا گیا۔ اس کے متعلق اپنی طرف سے کچھ کہے بغیر زیادہ تر ان باتوں کو نقل کرنا مناسب سمجھتا ہوں جو خود اکابرِ امتؒ نے تحریر فرمائی ہیں۔

مفتی رشید احمد لدھیانویؒ لکھتے ہیں:

اسلام میں مغربی جمہوریت کا کوئی تصور نہیں، اس میں متعدد گروہوں کا وجود (حزبِ اقتدار و حزبِ اختلاف) ضروری ہے جب کہ قرآن اس تصور کی نفی کرتا ہے:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ (آل عمران)

اس میں تمام فیصلے کثرتِ رائے سے ہوتے ہیں جب کہ قرآن اس اندازِ فکر کی بیخ کنی کرتا ہے:

﴿وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭاِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ﴾ (الأنعام)

یہ غیر فطری نظام یورپ سے درآمد ہوا ہے جس میں سروں کو گنا جاتا ہے تولا نہیں جاتا۔ اس میں مرد وعورت، پیر وجواں، عامی وعالم، بلکہ دانا وناداں سب ایک ہی بھاؤ تلتے ہیں۔

جس امیدوار کے پلے ووٹ زیادہ پڑ جائیں وہ کامیاب قرار پاتا ہے اور دوسرا سراسر ناکام۔ مثلاً کسی آبادی کے پچاس علماء، عقلاء اور دانشوروں نے بالاتفاق ایک شخص کو ووٹ دیے، مگر ان کے بالمقابل علاقہ کے بھنگیوں، چرسیوں اور بے دین واوباش لوگوں نے اس کے مخالف امیدوار کو ووٹ دیے جن کی تعداد اکاون ہوگئی تو یہ امیدوار کامیاب اور پورے علاقہ کے سیاہ وسفید کا مالک بن گیا۔ یہ مفروضہ نہیں حقیقتِ واقعہ ہے۔

آگے چل کر تحریر کرتے ہیں:

پھر ووٹ لینے کے لیے ہر جائز وناجائز حربہ کا استعمال لازمۂ جمہوریت ہے، لیلائے اقتدار کی خاطر تمام انسانی اقدار بلکہ خونی رشتہ تک فراموش کر دیے جاتے ہیں۔۔۔۔۔ ہر فریق اپنے مقابل کو چت کرنے کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہاتا ہے، چناں چہ ہر الیکشن میں اربوں روپے برباد ہوتے ہیں۔ مزید برآں دھونس، دھاندلی، دھوکا، فریب، رشوت، غرض تمام ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے ہیں۔ اور کوئی ہتھکنڈا کارگر نہ ہو تو مخالف ووٹروں کو ڈرایا دھمکایا بلکہ قتل تک کر دیا جاتا ہے۔

پھر لکھتے ہیں:

پھر قوم کے یہ نمائندے اسمبلی میں بیٹھ کر کیا گل کھلاتے ہیں؟ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔۔۔

مزید فرماتے ہیں:

یہ تمام برگ وبار مغربی جمہوریت کے شجرۂ خبیثہ کی پیداوار ہیں۔ اسلام میں اس کافرانہ نظام کی کوئی گنجائش نہیں، نہ ہی اس طریقے سے قیامت تک اسلامی نظام آسکتا ہے۔ بفحوائے "الجنس يميل إلى الجنس" عوام (جن میں اکثریت بے دین لوگوں کی ہے) اپنی ہی جنس کے نمائندے منتخب کر کے اسمبلیوں میں بھیجتے ہیں۔

اسلام میں شورائی نظام ہے جس میں اہل الحل والعقد غور وفکر کر کے ایک امیر کا انتخاب کرتے ہیں، چناں چہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت چھ اہل الحل والعقد کی شوریٰ بنائی جنھوں نے اتفاقِ رائے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو نامزد کیا۔

اس پاکیزہ نظام میں انسانی سروں کو گننے کی بجائے انسانیت کا عنصر تولا جاتا ہے، اس میں کسی ایک ذی صلاح مدبر انسان کی رائے لاکھوں بلکہ کروڑوں انسانوں کی رائے پر بھاری ہوسکتی ہے۔

گریز از طرزِ جمھوری غلام پختہ کاری شو

کہ در مغز دو صد خر فکر انسانی نمی آید

(احسن الفتاوی)

مولانا یوسف لدھیانویؒ ایک جگہ تحریر فرماتے ہیں:

کس قدر افسوس ناک اور لائقِ صد ماتم ہے یہ منظر کہ جن حضرات کے کندھوں پر ملک وملت کی قیادت کی رہنمائی کا بار ہے ان کی نظر سے راہ ورسمِ منزل او جھل ہو رہی ہے اور وہ حزبی وگروہی بھول بھلیوں بھٹک رہے ہیں۔ اس تلخ نوائی پر معذرت خواہ ہوں لیکن اظہارِ دردِ دل کے بغیر چارہ نہیں:

مرا دردی ست اندر دل اگر گویم زبان سوزد

وگر در در کشتم ترسم کہ مغز استخوان سوزد

حالات کی شدت مجبور کر رہی ہے کہ کسی لاگ لپیٹ کے بغیر صاف صاف عرض کیا جائے:

نوارا تلخ تر می زن چون ذوق نغمہ کم یابی

حدی را تیز تر می خوان چون محمل را گران بنی

ایک جگہ بڑی تفصیل سے لکھتے ہیں کہ:

بعض غلط نظریات قبولیتِ عامہ کی ایسی سند حاصل کر لیتے ہیں کہ بڑے بڑے عقلاء اس قبولیت عامہ کے آگے سر ڈال دیتے ہیں۔ وہ یا تو ان غلطیوں کا ادراک ہی نہیں کر پاتے یا اگر ان کو غلطی کا احساس ہو بھی جائے تو اس کے خلاف لب کشی کی جرأت نہیں کر سکتے۔ دنیا میں جو بڑی بڑی غلطیاں رائج ہیں ان کے بارے میں اہلِ عقل اسی المیہ کا شکار ہیں۔ مثلاً بت پرستی لے لیجیے، خدائے وحدہ لا شریک لہ کو چھوڑ خود تراشیدہ پتھروں اور مورتیوں کے سر بسجود ہونا کس قدر غلط اور باطل ہے۔ انسانیت کی اس سے بڑھ کر توہین و تذلیل کیا ہو گی کہ انسان کو، جو اشرف المخلوقات ہے، بے جان مورتیوں کے سامنے سرنگوں کر دیا جائے اور اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہو گا کہ حق تعالی شانہ کے ساتھ مخلوق کو شریکِ عبادت کیا جائے۔ لیکن مشرک برادری کے عقلاء کو دیکھو کہ وہ خود تراشیدہ پتھروں، درختوں، جانوروں وغیرہ کے سجدہ کرتے ہیں۔ تمام تر عقل و دانش کے باوجود ان کا ضمیر اس کے خلاف احتجاج نہیں کرتا اور نہ ہی وہ اس میں کوئی قباحت محسوس کرتے ہیں۔

اسی غلط قبولیت عامہ کا سکہ آج "جمہوریت" میں چل رہا ہے۔ جمہوریت دورِ جدید کا وہ "صنمِ اکبر" ہے جس کی پرستش اول اول دانایانِ مغرب نے شروع کی۔ چوں کہ وہ آسمانی ہدایت سے محروم تھے اس لیے ان کی عقل نارسا نے دیگر نظام ہائے حکومت کے مقابلہ میں جمہوریت کا بت تراش لیا اور پھر اس کو مثالی طرزِ حکومت قرار دے کر اس کا صور اس بلند آہنگی سے پھونکا کہ پوری دنیا میں اس کا غلغلہ بلند ہوا یہاں تک کہ مسلمانوں نے بھی تقلیدِ مغرب میں جمہوریت کی مالا جپنی شروع کر دی۔ کبھی یہ نعرہ بلند کیا گیا کہ "اسلام جمہوریت کا علمبردار ہے" اور کبھی "اسلامی جمہوریت" کی اصطلاح وضع کی گئی، حالانکہ مغرب جمہوریت کے جس بت کا پجاری ہے اس کا نہ صرف یہ کہ اسلام سے کوئی تعلق نہیں بلکہ وہ اسلام کے سیاسی نظریہ کی ضد ہے۔ اس لیے اسلام کے ساتھ جمہوریت کا پیوند لگانا اور جمہوریت کو مشرف بہ اسلام کرنا صریحاً غلط ہے۔

سب جانتے ہیں کہ اسلام نظریۂ خلافت کا داعی ہے جس کی رو سے اسلامی مملکت کا سربراہ آنحضرت ﷺ کے خلیفہ اور نائب کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ کی زمین پر احکامِ الٰہیہ کے نفاذ کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔۔۔۔۔

اس کے برعکس جمہوریت میں عوام کی نمائندگی کا تصور کار فرما ہے۔ چناں چہ جمہوریت کی تعریف ان الفاظ میں کی جاتی ہے۔

"جمہوریت وہ نظامِ حکومت ہے جس میں عوام کے چنے ہوئے نمائندوں کی اکثریت رکھنے والی سیاسی جماعت حکومت چلاتی ہے اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتی ہے۔"

گویا اسلام کے نظامِ خلافت اور مغرب کے تراشیدہ نظام جمہوریت کا راستہ پہلے ہی قدم پر الگ الگ ہو جاتا ہے۔ چناں چہ۔۔۔

* خلافت، رسول اللہ ﷺ کی نیابت کا تصور پیش کرتی ہے اور جمہوریت عوام کی نیابت کا تصور پیش کرتی ہے۔

* خلافت مسلمانوں کے سربراہ پر اقامتِ دین کی ذمہ داری عائد کرتی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی زمین پر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ نظامِ عدل کو نافذ کیا جائے، جب کہ جمہوریت کو نہ خدا اور رسول سے کوئی واسطہ ہے نہ دین اور اقامتِ دین سے کوئی غرض ہے۔ اس کا کام عوام کی خواہشات کی تکمیل ہے اور وہ ان کی منشاء کے مطابق قانون سازی کی پابند ہے۔

* اسلام منصبِ خلافت کے لیے خاص شرائط عائد کرتا ہے، مثلاً مسلمان ہو، عاقل و بالغ ہو، سلیم الحواس ہو، مرد ہو، عادل ہو، احکامِ شرعیہ کا عالم ہو۔ جب کہ جمہوریت ان شرائط کی قائل نہیں۔ جمہوریت یہ ہے کہ جو جماعت بھی عوام کو سبز باگ دکھا کر اسمبلی میں زیادہ نشستیں حاصل کر لے اسی کو عوام کی نمائندگی کا حق ہے۔ جمہوریت کو اس سے بحث نہیں کہ عوامی اکثریت حاصل کرنے والے ارکان مسلمان ہیں یا کافر، نیک ہیں یا بد، متقی و پرہیز گار ہیں یا فاجر و بدکار، احکامِ شرعیہ کے عالم ہیں یا جاہلِ مطلق اور لائق ہیں یا کندۂ ناتراش۔ الغرض جمہوریت میں عوام کی پسند و ناپسند ہی سب سے بڑا معیار ہے اور اسلام نے جن اوصاف و شرائط کا کسی حکمران میں پایا جانا ضروری قرار دیا، وہ عوام کی حمایت کے بعد سب لغو اور فضول ہیں اور جو نظامِ سیاست اسلام نے مسلمانوں کے لیے وضع کیا ہے وہ جمہوریت کی نظر میں محض بے کار اور لایعنی ہے۔ (نعوذ باللہ)

* خلافت میں حکمران کے لیے بالاتر قانون، کتاب و سنت ہے اور اگر مسلمانوں کا اپنے حکام کے ساتھ نزاع ہو جائے تو اس کو اللہ و رسول ﷺ کی طرف رد کیا جائے گا اور کتاب و سنت کی روشنی میں اس کا فیصلہ کیا جائے گا جس کی پابندی راعی اور رعایا دونوں پر لازم ہو گی۔ جب کہ جمہوریت کا فتویٰ یہ ہے کہ مملکت کا آئین سب سے مقدس دستاویز ہے اور تمام نزاعی امور میں آئین و دستور کی طرف رجوع لازم ہے۔ حتیٰ کہ عدالتیں بھی آئین کے خلاف فیصلہ صادر نہیں کر سکتی۔

لیکن ملک کا دستور اپنے تمام تر تقدس کے باوجود عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ کا کھلونا ہے۔ وہ مطلوبہ اکثریت کے بل بوتے پر اس میں جو چاہیں ترمیم و تنسیخ کرتے پھریں، ان کو کوئی روکنے والا نہیں اور مملکت شہریوں کے لیے جو قانون چاہیں بنا ڈالیں کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔۔۔

* تمام دنیا کے عقلاء کا قاعدہ ہے کہ کسی اہم معاملہ میں اس کے ماہرین سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ اسی قاعدے کے مطابق اسلام نے انتخابِ خلیفہ کی ذمہ داری اہلِ حل و عقد پر ڈالی ہے جو رموزِ مملکت کو سمجھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ اس کے لیے موزوں ترین شخصیت کون ہو سکتی ہے۔۔۔۔ لیکن بت کدۂ

جمہوریت کے برہمنوں کا فتوی یہ ہے کہ حکومت کے انتخاب کا حق ماہرین کو نہیں بلکہ عوام کو ہے کے ان کے بجائے عوام سے مشورہ لیا جاتا ہے۔ کسی معمولی سے معمولی ادارے کو چلانے کے لیے بھی اس کے ماہرین سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ کیسی ستم ظریفی ہے کہ حکومت کا ادارہ (جو تمام اداروں کی ماں ہے اور مملکت کے تمام وسائل جس کے قبضہ میں ہیں، اس کو) چلانے کے لیے ماہرین سے نہیں بلکہ عوام سے رائے لی جاتی ہے۔ حالانکہ عوام کی ننانوے فی صد اکثریت یہ نہیں جانتی کہ حکومت کیسے چلائی جاتی ہے، اس کی پالیسیاں کیسے مرتب کی جاتی ہیں اور حکمرانی کے اصول و آداب اور نشیب و فراز کیا کیا ہیں۔ ایک حکیم و دانا کی رائے کو ایک گھسیارے کی رائے کے ہم وزن شمار کرنا اور کندۂ ناتراش کی رائے کو ایک عالی دماغ مدبر کی رائے کے برابر قرار دینا، یہ وہ تماشا ہے جو دنیا کو پہلی بار جمہوریت کے نام سے دکھایا گیا ہے۔

در حقیقت "عوام کی حکومت، عوام کے لیے اور عوام کے مشورے سے" کے الفاظ محض عوام کو الو بنانے کے لیے وضع کیے گئے ہیں۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ جمہوریت میں نہ تو عوام کی رائے کا احترام کیا جاتا ہے اور نہ ہی عوام کی اکثریت کے نمائندے حکومت کرتے ہیں۔ کیوں کہ جمہوریت میں اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جاتی کہ عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لیے کون کون سے نعرے لگائے جائیں گے اور کن کن ذرائع کو استعمال کیا جائے گا۔ عوام کی ترغیب و تحریص کے لیے ہتھکنڈے بھی استعمال کئے جائیں، ان کو گمراہ کرنے کے لیے جو سبز باغ بھی دکھائے جائیں اور انھیں فریفتہ کرنے کے لیے ذرائع بھی استعمال کیے جائیں وہ جمہوریت میں سب روا ہیں۔

اب ایک شخص خواہ کیسے ہی ذرائع استعمال کرے، اپنے حریفوں کے مقابلے میں زیادہ ووٹ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے، وہ "عوام کا نمائندہ" شمار کیا جاتا ہے حالانکہ عوام بھی جانتے ہیں کہ اس شخص نے عوام کی پسندیدگی کی بناء پر ووٹ حاصل نہیں کیے بلکہ روپے پیسے سے ووٹ خریدے ہیں، دھونس اور دھاندلی کے حربے استعمال کیے ہیں اور غلط وعدوں سے عوام کو دھوکا دیا ہے۔ لیکن ان تمام چیزوں کے باوجود یہ شخص نہ روپے پیسے کا نمائندہ کہلاتا ہے، نہ دھونس اور دھاندلی کا منتخب شدہ اور نہ جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی کا نمائندہ شمار کیا جاتا ہے، چشم بد دور! یہ قوم کا نمائندہ کہلاتا ہے۔ انصاف کیجیے کہ "قوم کا نمائندہ" اسی قماش کے آدمی کو کہا جاتا ہے؟ اور کیا ایسے شخص کو ملک و قوم سے کوئی ہمدردی ہو سکتی ہے؟

عوامی نمائندگی کا مفہوم تو یہ ہونا چاہیے کہ عوام کسی شخص کو ملک و قوم کے لیے مفید ترین سمجھ کر اسے بالکل آزادانہ طور پر منتخب کریں، نہ اس امیدوار کی طرف سے کسی قسم کی تحریص و ترغیب ہو، نہ کوئی دباو ہو، نہ برادری اور قوم کا واسطہ ہو، نہ روپے پیسے کا کھیل ہو، الغرض اس شخصیت کی طرف سے اپنی نمائش کا کوئی سامان نہ ہو اور عوام کو بے وقوف بنانے کا اس کے پاس کوئی حربہ نہ ہو۔ قوم نے اس کو صرف اور صرف اس بناء پر منتخب کیا ہو کہ یہ اپنے علاقے کا لائق ترین آدمی ہے۔ اگر ایسا انتخاب ہوا کرتا تو بلاشبہ یہ عوامی انتخاب ہوتا اور اس شخص کو قوم کا منتخب نمائندہ کہنا صحیح ہوتا لیکن عملاً جو جمہوریت ہمارے یہاں رائج ہے، یہ عوام کے نام پر عوام کو دھوکا دینے کا ایک کھیل ہے اور بس۔

کہا جاتا ہے کہ جمہوریت میں عوام کی اکثریت کو اپنے نمائندوں کے ذریعے حکومت کرنے کا حق دیا جاتا ہے۔ یہ بھی محض ایک فریب نعرہ ہے ورنہ عملی طور پر یہ ہو رہا ہے کہ جمہوریت کے غلط فارمولے کے ذریعے ایک محدود سی اقلیت، اکثریت کی گردنوں پر مسلط ہو جاتی ہے! مثلاً فرض کر لیجیے کہ ایک

حلقۂ انتخاب میں ووٹوں کی کل تعداد پونے دو لاکھ ہے، پندرہ امیدوار ہیں، ان میں سے ایک شخص تیس ہزار ووٹ حاصل کر لیتا ہے جن کا تناسب دوسرے امیدواروں کو حاصل ہونے والے ووٹوں سے زیادہ ہے حالانکہ اس نے صرف ۱۶ فیصد ووٹ حاصل کیے ہیں۔ اس طرح ۱۶ فیصد کے نمائندے کو ۸۴ فیصد پر حکومت کا حق حاصل ہوا۔ فرمائیے! یہ جمہوریت کے نام پر ایک محدود اقلیت کو غالب اکثریت کی گردنوں پر مسلط کرنے کی سازش نہیں تو اور کیا ہے؟۔۔۔۔۔۔

الغرض جمہوریت کے عنوان سے "عوام کی حکومت، عوام کے لیے "کا دعوی محض ایک فریب ہے اور اسلام کے ساتھ اس کی پیوندکاری فریب در فریب ہے۔ اسلام کا جدید جمہوریت سے کوئی تعلق نہیں، نہ جمہوریت کو اسلام سے کوئی واسطہ۔ضدان لا یجتمعان۔

آگے ایک استفتاء کے تحت لکھتے ہیں:

سب سے پہلے تو یہی بات اسلام کی روح اور اس کے مزاج کے خلاف ہے کہ کوئی شخص مسندِ اقتدار کے لیے اپنے آپ کو پیش کرے، اسلام ان لوگوں کو حکومت کا اہل سمجھتا ہے جو اس کو ایک مقدس امانت سمجھتے ہوں اور عہدہ و منصب سے اس بناء پر خائف ہوں کہ وہ اس امانت کا حق بھی ادا کر سکیں گے یا نہیں؟ اس کے برعکس موجودہ طریقِ انتخاب اقتدار کو ایک مقدس امانت قرار دینے کے بجائے حریصانِ اقتدار کا کھلونا بنا دیتا ہے۔ حدیث میں ہے کہ "ہم ایسے شخص کو عہدہ نہیں دیا کرتے جو اس کا طلب گار ہو یا اس کی خواہش رکھتا ہو" (بخاری و مسلم)

ان ہی چند باتوں پر اکتفاء کرتا ہوں تفصیل کے لیے دیکھیے 'آپ کے مسائل اور ان کا حل'، احسن الفتاوی، سیاست اور اسلام وغیرہ۔ امید ہے کہ ذکر کردہ چند باتیں حقیقت کے انکشاف میں کافی حد تک موثر ہوئی ہوں گی۔ اب چلتے ہیں ووٹ کی ان حیثیات کی طرف جو مفتی صاحبؒ و دیگر نے متعین کی ہیں۔

ووٹ بحیثیتِ شہادت:

ووٹ کی پہلی حیثیت جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا "شہادت" کی ہے چناں چہ مفتی صاحبؒ لکھتے ہیں:

"ایک حیثیت شہادت کی ہے کہ ووٹر جس شخص کو اپنا ووٹ دے رہا ہے اس کے متعلق اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہ شخص اس کام کی قابلیت رکھتا ہے اور دیانت اور امانت بھی، اور اگر واقع میں اس شخص کے اندر یہ صفات نہیں ہیں اور ووٹر جانتے ہوئے اس کو ووٹ دیتا ہے تو وہ ایک جھوٹی شہادت ہے جو سخت گناہِ کبیرہ ہے اور وبالِ دنیا و آخرت ہے"۔

آگے لکھتے ہیں:

"خلاصہ یہ کہ ووٹ کی شرعی حیثیت کم از کم ایک شہادت کی ہے جس کا چھپانا بھی حرام ہے اور اس میں جھوٹ بولنا بھی حرام ہے۔"

مزید فرماتے ہیں:

”قرآن وسنت کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نااہل ظالم وفاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہِ عظیم ہے۔اسی طرح ایک اچھے نیک اور قابل آدمی کو ووٹ ثوابِ عظیم بلکہ ایک فریضۂ شرعی ہے۔قرآنِ کریم نے جیسے جھوٹی شہادت کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح سچی شہادت کو واجب ولازم بھی قرار دیا ہے،ارشاد باری ہے:

﴿کونوا قوامین بالقسط الخ...﴾

ووٹ کے شہادت ہونے پر ایک نظر:

سب سے پہلے شہادتِ شرعی کی تعریف جانتے چلیں:

[هي إخبار بحق للغير على الغير على مشاهدة لا على ظن.] (ملتقى الأبحر)

[هي في اصطلاح الشرع عبارة عن إخبار بصدق مشروط فيه مجلس القضاء ولفظة الشهادة.] (تبيين الحقائق)

[هي لغة: خبر قاطع، وشرعا: إخبار صدق لإثبات حق بلفظ الشهادة في مجلس القاضي ولو بلا دعوى كما في عتق الأمة.] (الدر المختار)

شہادت کی تعریف میں چند اجزاء نظر آرہے ہیں:

۱-اخبار، ۲-حق غیر، ۳- مجلسِ قضاء، ۴-لفظِ شہادت

اب دیکھنا یہ ہے کہ ووٹ میں ان میں سے کوئی چیز پائی جارہی ہے یا نہیں؟

جزء اول اخبار:

ووٹ ”اخبار“ نہیں بلکہ ”انشاء“ ہے، دلیل اس کی یہ ہے کہ ”اخبار“ کہتے ہیں ماضی میں کسی چیز کے متعلق خبر دینا اور ووٹ دینے میں یہ ہوتا ہے کہ ایک شخص جو اب تک منصبِ اقتدار پر نہیں آیا ہے ووٹ کے ذریعے اسے اس منصب پر فائز کیا جاتا ہے، امیدواروں کا زمامِ اقتدار سنبھالنے میں ووٹروں کا یہ عمل ہی موثر اور فاعل ہوتا ہے۔اور ”انشاء“ کہتے ہی ہیں ایک ایسے معاملے کو جو پہلے سے نہ ہو بلکہ فاعل کے فعل کے بعد وہ وجود میں آئے۔

شبہ کا جواب:

کوئی یہ کہے کہ ووٹ اخبار ہی ہے، کیوں کہ اس میں اس بات خبر دی جارہی ہے کہ امیدوار اس منصب کا اہل اور لائق ہے۔

جواب اس کا یہ ہے کہ اگر بات اتنی ہی تھی تو اس ووٹ کے ذریعے محض اس کی اہلیت کا ہی ثبوت ہوتا ہے، پھر کوئی تیسری چیز ہوتی جو اسے منصب پر فائز کرتی؟؟ لیکن یہاں ایسا نہیں ہے بلکہ کثرت کی صورت میں ووٹ ہی اس امیدوار کو منصب پر فائز کرتا ہے لہذا یہ کہنا درست نہ ہوا۔

اگر اس بات کو درست مان بھی لیں کہ ووٹ امیدوار کی اہلیت کے اخبار کا نام ہے تو شریعت میں اسے ”تزکیہ“ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔ووٹ تزکیہ ہے یا نہیں؟ یہ جاننے سے پہلے تزکیہ کی تعریف واقسام جانتے چلیں:

تزکیہ کی دو صورتیں ہیں: ۱-تزکیۂ سر، ۲-تزکیۂ اعلانیہ

تزکیۂ سر:

[التزكية في السر أن يبعث القاضي أمينا إلى المعدل ويكتب إليه كتابا فيه اسم الشاهد ونسبته ومحلته ومسجده فيسئل عن جيرانه وأصدقائه فإذا عرفهم بالعدالة يكتب هو عدل وإذا عرفهم بالفسق يكتب والله أعلم بحاله أو لا يكتب شيئا احترازا عن كشف الستر وإذا لم يعرفهم بالعدالة أو بالفسق يكتب هو مستور ويرده إلى القاضي سرا كيلا يظهر فيخدع.] (مجمع الأنهر)

ظاہر ہے تزکیۂ سر کی تعریف ووٹ پر صادق نہیں آ رہی ہے کیوں بنیادی طور پر یہاں کوئی قاضی ہی نہیں ہے، پھر نہ ہی کوئی ان امیدواروں کے متعلق معلومات فراہم کرنے جاتا ہے، بلکہ مدار وہ ساری باتیں ہوتی ہیں جو امیدوار اپنے متعلق کہے اور عوام میں اپنے کارنامے گنوائے، نیز خود معدل میں عدالت ہونی چاہیے اور یہاں ہر کس و ناکس کو ووٹ دینے کا اختیار ہے۔ ان سب باتوں کے پیشِ نظر ووٹ کو تزکیۂ سر کیسے کہا جائے؟

اگر مان لیں کہ ووٹ تزکیۂ سر ہے تو بھی یہ بات درست نہیں ہے کیوں کہ تزکیۂ سر کو فقہاء نے شہادت قرار نہیں دیا ہے بلکہ ایک عادل کی خبر کافی ہے اور بات شہادت کو لیکر چلی تھی:

لأن التزكية من أمور الدين فلا يشترط فيها إلا العدالة حتى تجوز تزكية العبد والمرأة والأعمى والمحدود في القذف. (مجمع الأنهر)

تزکیۂ علانیہ:

والتزكية في العلانية أن يجمع القاضي بين المعدل والشاهد في مجلسه لتنتفي شبهة تعديل غيره. (مجمع الأنهر)

ووٹ تزکیۂ اعلانیہ بھی نہیں ہے کیوں کہ یہاں وہ بات جو مدارِ تفریق بین التزکیتین ہے کہ معدل و مزکی مجلسِ قضاء میں آکر بطور شاہد مزکی کے متعلق کہے؛ نہیں پائی جا رہی ہے گو فقہاء نے اس کو شہادت کہا ہے۔ الغرض ووٹ کو تزکیہ کہنا بھی درست نہیں ہے کیوں کہ دونوں کے مابین فرق واضح ہے۔ تمام فرقوں کو بالائے طاق رکھ کر اگر کہہ بھی دے کہ ووٹ تزکیہ ہے پھر بھی بات پوری نہیں ہوتی کیوں کہ اس سے زیادہ سے زیادہ اہلیت کا ثبوت ہو گا منصب کا حصول پھر بھی لازم نہیں آ رہا جبکہ ووٹ میں یہ بات مثل جزء لاینفک ہے۔

جزءِ ثانی حقِ غیر:

شہادت کی تعریف کا دوسرا جزء ہے غیر کے حق کی خبر دینا، یعنی جس حق کی گواہی دی جا رہی ہے وہ من کل الوجوہ غیر کا ہو، اسی لیے اقرار و انکار اور دعوۂ اصیل کو شہادت نہیں کہا جائے گا، کیوں کہ وہ اخبار لنفسہ ہے، اسی طرح دعوۂ وکیل گو من وجہ دعوی لغیرہ ہے لیکن چوں کہ وہ ترجمان ہے اصیل کا، گویا اصیل خود مدعی ہوا۔ مجمع میں ہے:

[للغير أي حصل للغير من كل الوجوه كما هو المتبادر فيخرج عنه الإنكار فإنه إخبار لنفسه وكذا دعوى الأصيل فإنه إخبار به لنفسه في يد غيره وكذا دعوى الوكيل فإنه ليس بإخبار للغير من كل الوجوه.] (مجمع الأنهر)

اسی وجہ سے شہادت کی شرائط میں یہ بات ذکر کی گئی ہے کہ اس شہادت سے شاہد کا نفع و نقصان وابستہ نہ ہو: [وأن يشهد لله تعالى ولا يجر الشاهد إلى نفسه مغنما ولا يدفع عن نفسه مغرما.] (الهندية)

اور ووٹ میں خود ووٹ دینے والے کا نفع و نقصان اس امر سے وابستہ ہوتا ہے لہذا ووٹ کو شہادت کہنا درست نہ ہوا۔

جزء ثالث مجلسِ قضاء:

شہادت کی تعریف کا ایک جزء مجلسِ قضاء کا ہونا ہے اور یہ شرائطِ شہادت میں سے ہے چناں چہ رد المحتار میں ہے: [ومایرجع إلی مکانھا واحد وھو مجلس القضاء.] (رد المحتار)

اور ووٹ دینے میں قاضی ہی کوئی نہیں ہوتا تو مجلسِ قضاء کا کیا سوال؟ یہاں تو ووٹر خود ہی شاہد و مزکی بھی ہے اور قاضی بھی۔

راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو

جزء رابع لفظِ شہادت:

شہادت کی تعریف کا ایک جزء لفظِ شہادت بھی ہے یعنی کوئی خبر اس وقت شہادت بنے گی جب کہ اسے لفظِ شہادت سے ادا کیا جائے۔ اس کی اہمیت کے لیے یہ بات کافی ہے کہ یہ شہادتِ شرعی کا رکن ہے اور شہادت کے ہم معنی الفاظ بھی اس باب میں قابل قبول نہیں بلکہ شہادت مصدر کا ماضی بھی شہادت کے لیے کافی نہیں ہو گا۔

عبارات ملاحظہ کیجیے:

[وشرطها لفظ الشهادة في جميع ما تقدم لورود عبارة النص كذلك ولكونه من ألفاظ اليمين فكان الامتناع عن الكذب بهذا اللفظ أشد.] (مجمع الأنهر)

[وأما ركنها فلفظ أشهد بمعنى الخبر دون القسم.] (الهندية)

[وركنها لفظ أشهد لا غير لتضمنه معنى مشاهدة وقسم وإخبار للحال فكأنه يقول أقسم بالله لقد اطلعت على ذلك وأنا أخبر به، وهذه المعاني مفقودة في غيره حتى لو زاد فيما أعلم بطل للشك.] (رد المحتار)

[جرى على ألسنة الأمة سلفها وخلفها في أداء الشهادة أشهد مقصرين عليه دون غيره من الألفاظ الدالة على تحقيق الشيء نحو أعلم وأتيقن، وهو موافق لألفاظ الكتاب والسنة أيضا فكان كالإجماع على تعيين هذه اللفظة دون غيرها، ولا يخلو عن معنى التعبد، إذ لم ينقل غيره.] (البحر الرائق)

[الشهادة اسم من المشاهدة وهي الاطلاع على الشيء عيانا فاشترط في الأداء ما ينبئ عن المشاهدة واختصت بشيء يدل على ذلك وهو ما اشتق من اللفظ وهو أشهد بلفظ المضارع، ولا يجوز شهدت، لأن الماضي موضوع للإخبار عما وقعت نحو قمت أي فيما مضى من الزمان، فلو قال شهدت احتمل الإخبار عن الماضي، فيكون غير مخبر به في الحال.] (البحر الرائق)

اب ووٹ کو دیکھیے اس میں الفاظ کا وجود ہی نہیں ہے چہ جائے کہ الفاظِ شہادت ہوں پھر ووٹ کو شہادت کیوں کر قرار دیا جائے؟ اگر کوئی کہے کہ مشین کا بٹن دبانا یا نشان لگانا یہ "أشهد" کے قائم مقام ہے تو اس کا جواب واضح ہے کہ جب "أعلم"، "أتقن" جیسے الفاظ بلکہ "شہدت" کو بھی اس باب میں قابل قبول نہیں مانا گیا تو سرے سے لفظ کا ہی جہاں وجود نہ ہو وہاں شہادت کیسے متحقق ہو سکتی ہے؟

گویا اجزاءِ شہادتِ شرعی میں سے کوئی جزء بھی ووٹ میں نہیں پایا جارہا ہے تو پھر ووٹ کو شہادت کہنا اور پھر اس پر وہی وعدہ و وعید مرتب کرنا کیا معنی رکھتا ہے؟

علاوہ ازیں تحمل شہادت کے لیے عقلِ کامل ہونا، بینا ہونا، مشہود بہ کا معاینہ دیکھنا علاوہ چند مستثنیٰ مواقع کے ضروری ہے۔ جب کہ ووٹ بینا اور نابینا سب کے لیے ضروری ہوتا ہے، نیز اداءِ شہادت کے لیے عقل، بلوغ، حریت، بصر، نطق، ولایت، محدود فی القذف نہ ہونا، عداوتِ دنویہ کا نہ ہونا، ولاد اور زوجیت کا رشتہ نہ ہونا شرط ہے (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ہندیہ، رد المحتار وغیرہ) جب کہ تمام ووٹروں کا ان تمام پر پورا اترنا فی زمانناشاذ ہے، نیز شہادت میں شاہد کا عادل ہونا ضروری ہے اور یہاں فساق کی کثرت ہے۔

شہادت کا یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ قاضی پر شہادت سے جو بات ثابت ہو اس کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہے۔(مجمع الأنهر) اور یہاں قاضی سرے سے ہے ہی نہیں بلکہ ووٹ یا ووٹر خود ہی قاضی ہے، اگر بالفرض والتقدیر قاضی مان بھی لیں تو سبھی امیدواروں کے ووٹروں کا ووٹ شہادت ہو گا اور اس صورت میں شہادتوں کا اختلاف ہی قبولِ شہادت کے لیے مانع ہو گا، اور اگر ہر ایک کے حق میں الگ الگ قضاء تسلیم کریں تو تمام کے حق میں شہادتِ کثیرہ پائی جائیں گے پھر ایک ہی منصب کے کئی حقدار ثابت ہوں گے اور یہ باطل ہے۔ اور آخر میں اگر مشہود علیہ مسلمان ہو تو شاہد کا بھی مسلمان ہونا شرط ہے، جب کہ ووٹ میں مسلم امیدوار کے حق میں کافر ووٹ بھی معتبر سمجھا جاتا ہے، اور سب کا درجہ برابر ہوتا ہے۔

الغرض ووٹ کو کسی بھی طرح شہادت قرار دینا درست نہیں ہے کیوں کہ اگر مذکورہ بالا وجوہ میں سے ایک بھی مفقود ہو تو وہ ووٹ کو خارج از شہادت کرنے کے لیے کافی ہے چہ جائے کہ ساری وجوہ جمع ہوں۔

نوٹ: شہادت کے لغوی معنی کے اعتبار سے ووٹ کو شہادت کہنا درست ہو سکتا ہے لیکن اہلِ علم پر یہ بات مخفی نہیں ہو گی کہ بیانِ حکمِ شرع کے وقت محض لغوی معنی کا لحاظ کرنا اور شرعی معنی وحیثیت کو انظر انداز کرنا کس قدر مضر ہو سکتا ہے۔

ووٹ بحیثیتِ شفاعت:

ووٹ کی دوسری حیثیت جو مفتی صاحبؒ نے قرار دی ہے وہ "شفاعت" کی ہے، چناں چہ فرماتے ہیں:

"دوسری حیثیت ووٹ کی شفاعت یعنی سفارش کی ہے کہ ووٹر اس نمائندگی کی سفارش کرتا ہے، اس کے بارے میں قرآنِ کریم کا یہ ارشاد ہر ووٹر کو اپنے سامنے رکھنا چاہیے:

﴿من يشفع شفاعة حسنة الخ﴾

اچھی سفارش یہی ہے کہ قابل اور دیانت دار آدمی کی سفارش کرے جو خلقِ خدا کے حقوق صحیح طور پر ادا کرے اور بری سفارش یہ ہے کہ نااہل، نالائق، فاسق، ظالم کی سفارش کرکے خلقِ خدا پر اس کو مسلط کردے، اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے ووٹوں سے کامیاب ہونے والا اپنے پنج سالہ دور میں جو نیک یا بد عمل کرے گا ہم بھی اس کے شریک سمجھے جائیں گے"

ووٹ کے شفاعت ہونے پر ایک نظر:

شفاعت کہتے ہیں کسی کی خاطر اپنا اثر ورسوخ استعمال کرنا بایں طور کہ اس کو کسی نفع تک پہنچانے یا کسی نقصان سے بچانے کے لیے بیچ میں پڑکر ثالثی کا کردار ادا کرنا۔

[والشفاعة هي التوسط بالقول في وصول الشخص ولو كان أعلى قدرا من الشفيع إلى منفعة من المنافع الدنيوية والأخروية أو خلاصه عن مضرة.] (روح المعاني)

[الشفاعة مأخوذة من الشفع وهو أن يصير الإنسان نفسه شفعا لصاحب الحاجة حتى يجتمع معه على المسألة فيها.] (مفاتيح الغيب)

[الشفاعة فيها معنى السؤال والتقاضي للإجابة.] (فتح الباري)

گویا شفاعت میں ایک شفیع، ایک مشفوع الیہ اور ایک مشفوع لہ ہوتے ہیں۔ شفیع کی حیثیت محض ایک وسیلہ اور واسطہ کی ہوتی ہے، اصل کام مشفوع الیہ کا ہوتا ہے کہ وہ چاہے تو اسے قبول کرے اور چاہے تو رد کردے۔

ووٹ کو اگر شفاعت یا سفارش کہا جائے تو ووٹر کی حیثیت شفیع کی، امیدوار کی مشفوع لہ کی اور جو اصل ہے یعنی مشفوع الیہ وہ یہاں ہے ہی نہیں! لہٰذا ووٹ کو شفاعت کہنا کیسے درست ہوا؟ پھر مشفوع الیہ کو ہر دو جانب کا اختیار ہے کہ وہ قبول کریں یا رد کردیں اور یہاں صرف ایک ہی پہلو ہے اس کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں۔ (آگے شرائط کے بیان میں مزید وضاحت آرہی ہے)

نیز سفارش کی کچھ شرطیں ہیں:

۱-سفارش جائز حق کے لیے ہو، ناجائز حق کے لیے نہیں۔

ووٹ کا مطالبہ جس منصب کے لیے وہ اکثر کے حق میں ناجائز حق ہی ثابت ہوا ہے۔ اور یہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔

۲-طالبِ سفارش اپنے مطالبہ کو بوجہ کمزوری خود بڑے لوگوں تک نہ پہنچا سکتا ہو۔

یہاں ایسا کچھ نہیں پایا جاتا ہے کیوں کہ آج کل تو مشینی ووٹ کا زمانہ ہے اور جو چاہے اس میں ترمیم کردے کوئی پوچھنے والا نہیں، الیکشن مہم تو محض ایک دھول جھونکنے کا ذریعہ ہے۔

۳-سفارش کرنے والا اپنی سفارش کے قبول کرنے پر اُس بڑے شخص کو مجبور نہ کرے، جس سے وہ سفارش کر رہا ہے۔

یہاں یوں تو مشفوع الیہ ہوتا ہی نہیں ہے اگر فرض کر بھی لیں تو کثرتِ ووٹ بمنزلۂ اجبار ہوگا جو کہ یہاں جائز نہیں ہے۔

۴-سفارش کرنے والا اس سفارش کو خالصتًا لوجہ اللہ ادا کرے، اس سے کوئی نفع وابستہ نہ ہو۔ ابو داوٗد کی روایت ہے: حضرت ابو اُمامہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس نے اپنے بھائی کے لیے سفارش کی، اس نے بدلے میں سفارش کرنے والے کو کوئی ہدیہ دے دیا، اور دوسرے نے قبول کر لیا تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں داخل ہو گیا۔ (سنن اَبی داوٗد)

واضح ہے کہ یہاں ووٹ دینے والے کے پیشِ نظر اپنا ہی نفع ہوتا ہے نہ کہ مشفوع لہ کا پس ووٹ کو شفاعت کہنا کیسے صحیح ہوا؟ (سفارش کی شرائط المسائل المہمہ، انفاسِ عیسی وغیرہ سے مستفاد ہیں)

الحاصل ووٹ کو سفارش کہنا بھی درست نہیں معلوم ہوتا ہے، کیوں کہ دونوں کے مابین کافی فرق پایا جارہا ہے۔

ووٹ بحیثیتِ وکالت:

ووٹ کی ایک حیثیت وکالت قرار دی ہے مفتی صاحبؒ نے، چناں چہ لکھتے ہیں:

"ووٹ کی تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹ دینے والا اس امیدوار کو اپنا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، لیکن اگر یہ وکالت کسی شخصی حق کے متعلق ہوتی تو اس کا نفع نقصان صرف اس کی ذات کو پہنچتا تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا، مگر یہاں ایسا نہیں، کیوں کہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے، اس لیے اگر کسی نااہل کو اپنی نمائندگی کے لیے ووٹ دے کر کامیاب بنایا تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس کی گردن پر رہا۔"

ووٹ بحیثیتِ وکالت پر ایک نظر:

وکالت کہتے ہیں:

[إقامة الغير مقام نفسه في تصرف معلوم.] (ملتقى الأبحر)

اس کے شرائط وارکان کچھ اس طرح ہیں:

[وشرطها كون المؤكل ممن يملك التصرف.] (ملتقى الأبحر)

[وأما الشرائط فأنواع....أما الذي يرجع إلى المؤكل فهو أن يكون ممن يملك فعل ما وكل به نفسه] (بدائع الصنائع)

[وأما ركنها فالألفاظ التي تثبت بها الوكالة من قوله وكلتك ببيع هذا العبد.] (الهندية)

ان عبارات اور وکالت کے باب میں اس کے مثل وارد عبارتوں سے یہ بات واضح ہے کہ ووٹ کو وکالت کہنا بھی درست نہیں ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ وکالت کے ثبوت کے لیے ضروری ہے کہ موکل خود اس تصرف کے کرنے پر قادر ہو جس کا اس نے وکیل بنایا ہے۔ جب کہ یہاں وہ بات نہیں ہے کیوں کہ ووٹر خود زمامِ حکومت کو سنبھالنے پر قادر نہیں ہے لہذا اسے کسی دوسرے کو کیسے سونپ سکتا ہے؟

ایک شبے کا ازالہ:

یہاں اگر کوئی اعتراض کرے کہ جمہوریت نام ہی اس نظامِ حکومت کا ہے جس میں عوام کے ہر فرد کو اقتدار اور حکومت کا اختیار ہے، اور اسی اختیار کا وہ اپنے نمائندوں کو مالک بناتا ہے، کیوں کہ جمہوریت عوام کی حکومت کا نام ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے بھی یہ بات گذری مولانا یوسف لدھیانویؒ کے حوالے سے کہ عوام کی حکومت اور عوام کی نمائندگی کا حقیقی مطلب کیا ہوتا ہے؟ اور جموری نظام میں اس کا کیا معنی لیا جاتا ہے۔ نیز یہ بات عقل کے بھی خلاف ہے کہ عوام کے ہر فرد کو حکومت کا اختیار ہو کیوں کہ اگر سب ہی حاکم ہوں گے تو محکوم کون ہو گا؟ حجر و شجر ہوں گے؟ اور ایسا نہیں ہے، پس جن لوگوں کو عوام نے اپنا نمائندہ بنایا ہیں وہ حاکم ہوئے اور عوام محکوم ہوئیں پھر عوام تو بے دست و پا ٹھہری اور ان کے ہاتھ سے اختیار جاتا رہا! کیوں کہ حاکمیت کہتے ہی ہیں کسی شخص کا کسی دوسرے کا پابند ہوئے بغیر خود اپنی مرضی سے حاکمانہ اختیارات استعمال کرنا یا دوسرے پر احکام جاری کرنا۔

اب اگر ووٹ کو وکالت کہا جائے تو موکل (ووٹر) ابتداء میں اس چیز کا اختیار رکھتا ہے (حقیقتا نہیں بلکہ حکما) لیکن آخر میں اسی شخص کے ذریعے اس کا اختیار مسلوب ہوتا ہے جسے اس نے خود اختیار دیا تھا۔ (یہ نیا فلسفہ بھی دنیا کے سامنے جمہوریت کی بدولت آیا ہے)

وکالت میں الفاظِ توکیل رکن کا درجہ رکھتے ہیں۔ ووٹ کو وکالت قرار دینا کیسے درست ہو گا جب کہ یہاں سرے سے لفظ کا وجود ہی نہیں؟

ووٹ اگر وکالت ہے تو اس کا ثمرہ موکل کو ملنا چاہیے، امیدوار کے جیتنے کی صورت میں منصبِ اقتدار ووٹر کو ملنا چاہیے، جیسے وکیل بالبیع کو بیچنے کے بعد جو ثمن حاصل ہو گا وہ موکل کا ہو گا نہ کہ وکیل کا۔ چناں چہ در مختار میں ہے: [والملك يثبت للمؤكل ابتداء في الأصح فلا يعتق قريب الوكيل بشرائه ولا يفسد نكاح زوجته به.] (الدر المختار)

وکالت موکل کی موت سے باطل ہو جاتی ہے اور یہاں یہ بات نہیں ہوتی ہے، کیوں کہ ووٹ دینے کے بعد ووٹر کا اگر انتقال ہو جائے تو بھی اس کا ووٹ شمار کیا جاتا ہے اور امیدوار کی کامیابی میں اس کا ووٹ زندوں کے ووٹ کے مثل کردار ادا کرتا ہے۔ پس ووٹ اور وکالت کا کیا تعلق؟

[وتبطل الوكالة بموت المؤكل] (ملتقى الأبحر)

نیز وکالت موکل کی ذات تک محدود رہتی ہے کیوں کہ دوسروں پر تصرف بغیر ولایتِ شرعیہ کے حاصل نہیں ہو سکتا اور یہاں کامیاب امیدوار کے ووٹر کا تصرف دوسروں کے ووٹروں پر بھی قائم ہو رہا ہے بایں طور کہ وہ ان پر بھی مسلط ہو رہا ہے، لہذا ووٹ کو وکالت کہنا کیسے درست ہوا؟

آخر میں یہ کہ ووٹ بیک وقت شہادت اور وکالت کیسے ہو سکتا ہے؟ کیوں کہ شہادت اخبار ہے اور وکالت انشاء اور شہادت من کل الوجوہ حق غیر سے متعلق ہے اور وکالت حق نفس سے۔ پس شہادت سے معلوم ہوتا ہے کہ ووٹ امیدوار کا حق ہے اور وکالت سے معلوم ہوتا ہے کہ ووٹر کا حق ہے۔ وہذا اجتماع المتناقضین۔

ووٹ بحیثیتِ مشورہ اور اس پر ایک نظر:

بعض حضرات ووٹ کو مشورہ کہتے ہیں۔ اوپر کی تفصیلات سے ہی اس کا رد ہو جاتا ہے کیوں کہ مشورہ میں امیر مشورہ کا ہونا ضروری ہے نیز امیرِ مشورہ اپنے فیصلہ میں خود مختار ہوتا ہے، اکثریت و اقلیت کا پابند نہیں ہوتا اور یہاں یہ دونوں روحیں مفقود ہیں۔ ذیل میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتاب سے ایک اقتباس نقل کرنا مناسب ہو گا جو مولانا نے ان لوگوں کے متعلق لکھا ہے، چناں چہ فرماتے ہیں:

بعض لوگوں کو یہ حماقت سوجھی ہے کہ وہ جمہوری سلطنت کو اسلام میں ٹھوسنا چاہتے ہیں اور دعوی کرتے ہیں کہ اسلام میں جمہوریت ہی کی تعلیم ہے، استدلال میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:﴿وشاورهم في الأمر﴾ مگر یہ بالکل غلط ہے، ان لوگوں نے مشورہ کی دفعات ہی کو دفع کر دیا اور اسلام میں مشورہ کا جو درجہ ہے اس کو بالکل نہیں سمجھا، اسلام میں مشورہ کا درجہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا تھا: اے بریرہ! تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو، قصہ یہ ہوا کہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہ پہلے باندی تھیں اور اسی حالت میں ان کا نکاح ایک شخص سے جن کا نام مغیث تھا، ان کے آقا نے کر دیا تھا، جب وہ آزاد ہوئیں تو قانونِ اسلام کے مطابق ان کو یہ اختیار دیا گیا کہ جو نکاح حالتِ غلامی میں ہوا اگر چاہیں اس کو باقی رکھیں اگر چاہیں فسخ کر دیں، اصطلاح شریعت میں اس کو اختیارِ عتق کہتے ہیں، اس اختیار کی بناء پر حضرت بریرہ نے نکاحِ سابق کو فسخ کر دیا، لیکن ان کے شوہر کو ان سے محبت تھی وہ صدمۂ فراق میں مدینہ کی گلی کوچوں میں روتے پھرتے تھے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو اس پر رحم آیا اور حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے آپ نے فرمایا: بریرہ کیا اچھا ہو اگر تم اپنے شوہر سے رجوع کر لو، وہ دریافت فرماتی ہیں یا رسول اللہ! یہ آپ کا حکم ہے یا مشورہ کا فرد، اگر حکم ہے تو بسر و چشم منظور ہے گو مجھ کو تکلیف ہی ہو، آپ نے فرمایا: حکم نہیں صرف مشورہ ہے، تو حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے صاف عرض کر دیا اگر مشورہ ہے تو اس کو قبول نہیں کرتی۔ لیجیے اسلام میں یہ درجہ ہے مشورہ کا کہ اگر نبی اور خلیفہ بھی رعایا کے کسی آدمی کو مشورہ دے تو اس کو حق ہے کہ مشورہ پر عمل نہ کرے، اور یہ محض ضابطہ کا حق نہیں بلکہ واقعی حق ہے، چناں چہ حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مشورہ پر عمل نہیں کیا، تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے ذرا بھی ناراض نہیں ہوئے اور نہ ہی حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا کو کچھ گناہ ہوا، نہ ان پر کچھ عتاب ہوا، سو جب امت یا رعایا اپنے نبی یا بادشاہ کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے اسلام میں مجبور نہیں تو نبی یا خلیفہ رعایا کے مشورہ سے کیوں کر مجبور ہو جائے گا کہ رعایا جو مشورہ دے اسی کے مطابق عمل کرے اس کے خلاف کبھی نہ کرے، پس﴿وشاورہم فی الامر﴾ سے صرف یہ ثابت ہوا کہ حکام رعایا سے مشورہ کر لیا کریں، یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کے مشورہ پر عمل بھی ضرور کیا کریں اور اگر کثرتِ رائے بادشاہ کے خلاف ہو جائے تو وہ کثیرین کے مشورہ پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے، اور جب تک یہ بات ثابت نہ ہو اس وقت تک﴿وشاورہم فی الامر﴾ سے جمہوریت ہرگز ثابت نہیں ہو سکتی۔ (اشرف الجواب)

الحاصل مندرجہ بالا تفصیلات کی بنیاد پر ووٹ کو شہادت، وکالت وغیرہ حیثیت دے کر اسے مشرف باسلام کرنا اور شرعی فریضہ گردانا درست نہ ہوا۔

حرفِ آخر

یہ سوال پھر بھی رہ جاتا ہے کہ ووٹ کا شرعی حکم کیا ہے؟ اس کا جواب گو ماقبل کی تحریر سے خود ہی واضح ہے یا مستنبط کیا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی تصریح ضروری ہے وہ یہ کہ ووٹ کو شریعت بنانا تو بالکل بھی درست نہیں ہے۔ رہی بات اس کے ناجائز و حرام ہونے کے باوجود اہون البلیتین کے تحت اس کے جواز کی تو وہ بھی چوں کہ اس بات پر مبنی تھا کہ اگر ووٹ نہ دیا جائے تو مسلمانوں کا نقصان ہو سکتا ہے۔ گویا دفعِ مضرت وجہ تھی۔
لیکن فی زمانہ چوں کہ معاملہ بالکل بدلا ہوا ہے اول تو امیدواروں میں کوئی ایسا ہے ہی نہیں جس کو مجبوراً ووٹ دے کر اگر منصبِ اقتدار پر لایا جائے تو وہ مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہو اور اگر یہ مانیں کہ کم از کم ظلم میں تقلیل کا باعث ہو گا تو یہ بات بھی اس وقت ہو گی کہ وہ آئے بھی اور اس طرح کا کردار دکھائے بھی ورنہ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت یہ ہے کہ ایک فریق سامنے سے اور دوسرا پیچھے سے حملہ آور ہے۔ کیوں کہ ملک ایک ایسے گروہ کے ہاتھوں سمٹ کر آگیا ہے کہ وہ جسے چاہیں اقتدار پر لائیں جسے چاہیں ہٹائیں، الیکشن تو محض ایک ڈرامہ ہے ورنہ پسِ پردہ معاملہ کچھ اور ہے جو اربابِ بصیرت پر مخفی نہیں ہے۔ لہذا حکم یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو خصوصاً اور پوری دنیا کے مسلمانوں کو عموماً اس کفریہ نظام سے اظہارِ برآت کرتے ہوئے اسلامی نظامِ خلافت کو لانے کی طرف بتدریج گامزن ہو جانا چاہیے اور اس معاملہ میں درویشانِ افغان سے سبق حاصل کرنا چاہیے ورنہ مستقبل تاریک سے تاریک تر ہوتا چلا جائے گا۔

واللہ اعلم بالصواب